© rasailojaraid.com

تحقیق و تنقید

قسط ۲ (آخری)

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

گزشتہ سے پیوستہ

نظریۂ ارتقاء

۳۔ تیسری آیت یہ ہے:

"وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا"

(۱) "حالانکہ اسی نے تم سب کو مختلف حالات میں پیدا کیا ہے۔" (تفسیر ثنائی)

(۲) "حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح (کی حالتوں) میں پیدا کیا ہے۔" (فتح محمد جالندھری)

(۳) "حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا ہے۔" (تفہیم القرآن) —— اور اس سے مولانا مودودی نے وہی تخلیقی مراحل مراد لیے ہیں جو رحمِ مادر میں ہوتے ہیں۔

پرویز صاحب اس آیت سے ارتقائے زندگی کے مراحل مراد لیتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسی وجہ نہیں کہ اس سے رحم مادر کے مراحل مراد نہ لیے جائیں جبکہ سورۃ علق کی مندرجہ بالا آیت اس کی وضاحت بھی کر رہی ہے اور کوئی ایسا قرینہ بھی موجود نہیں جس سے پرویز صاحب کے نظریہ کی تائید ہو سکے۔

۴۔ "وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا"

(۱) "اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے۔" (فتح محمد)

(۲) "اللہ نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔" (تفسیر ثنائی)

(۳) "اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا۔" (تفہیم القرآن)

پرویز صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں "اور ہم نے تمہیں زمین سے اگایا ایک طرح کا اگانا" اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ انسان نباتات اور حیوانات کے راستے سے ہوتا ہوا وجود میں آیا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیت مندرجہ بالا میں "نبت" کا لفظ لغوی اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسان سب پر اس کا یکساں استعمال ہوتا ہے۔ (امام راغب) اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی چیز خوب پھل پھول رہی ہو تو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے مثلاً "نبت الغلام" یعنی "لڑکے کا جوان ہونا، بچہ کی پرورش کرنا" (لازم ومتعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ المنجد "نبت ثدی الجاریۃ" "لڑکی کے پستان ابھر آنا" (منتہی الادب) اسی طرح جب ایک بچہ کی اس طرح پرورش ہو رہی ہو کہ وہ اپنی اصل عمر سے بڑا اور خوب پلا پوسا معلوم ہوتا ہو تو "انبت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

"فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا" (آل عمران ۳۷)

"تو خدا نے مریمؑ کو پسندیدگی کے قابل قبول فرمایا اور اسے اچھی طرح پرورش کیا"

اندریں صورت حال یہ آیت بھی نظریۂ ارتقاء کی کوئی مؤثر دلیل نہیں ہو سکتی۔

۵۔ قصۂ آدم کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے درج ذیل آیت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ"

(الاعراف ۱۱)

"اور ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہاری شکل صورت بنائی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو"

اس سے آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں جمع کا صیغہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدمؑ سے پہلے بنی نوع انسان موجود تھی کیونکہ ملائکہ کے سجدہ کا ذکر بعد میں ہوا ہے۔ پھر سورۂ اعراف کی آیات ۱۱۔۲۵ تک توجہ دلائی ہے جہاں کہیں آدم اور اس کی بیوی کے لیے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے، لیکن اکثر مقامات پر جمع کا صیغہ ہے۔

اس کے جواب میں اتنا ہی عرض کریں گے کہ آپ اگر آیات (۱۱-۲۵) کے بجائے (۲-۲۵) پر غور کرنے کو فرما دیتے تو تثنیہ کے صیغہ کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

ابتداء میں حضور اکرمؐ کے دور کے تمام موجود انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ "اپنے پروردگار سے نازل شدہ وحی کی تابعداری کرو" پھر آگے چل کر آدمؑ، آپ کی بیوی اور ابلیس وغیرہ کا قصہ مذکور ہے تو قرآن میں حسب محل صیغوں کا استعمال ہوا ہے۔ ان آیات کے مخاطب آدمؑ اور ان کی اولاد ہے نہ کہ آدمؑ اور ان کے آباء واجداد یا بھائی بند جو آپ کے خیال میں اس جنت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں رہتے تھے جس کے متعلق خدا نے فرمایا:

"یٰادَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔"

"اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو"

اگر جنت میں اس "آدم" کی سابقہ نسل بھی رہتی تھی تو محض آدم اور اس کی بیوی کو جنت میں رہنے کی ہدایت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔

اس آیت کا دوسرا پہلو جس کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت آدمؑ کو بطورِ خصوصی تخلیق پیدا کیا تھا تو آیتِ بالا میں "کم" کی ضمیر جمع کیوں استعمال ہوئی ہے؟ تو ہم عرض کریں گے کہ محاورۂ عرب میں موقع و محل کے لحاظ سے واحد کے لیے جمع کے استعمال کی اور بھی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔"

"اور جو شخص سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں"

تخلیقِ آدم سے متعلق درج ذیل آیت اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا۔" (الدھر)

"بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا"

اب دیکھیے "دہر" سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا آغاز ابتدائے آفرینش سے ہوا ہے اور عصر سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا آغاز تخلیقِ آدم سے ہوا ہے کیونکہ انسانی افعال و اعمال پر اللہ نے عصر کو بطورِ شہادت پیش کیا ہے دہر کو نہیں۔ ارشادِ باری ہے کہ اس "دہر" میں انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا۔ اگر وہ نباتات حیوانات یا بندر کی اولاد ہوتا تو یہ چیزیں تو سب قابلِ ذکر ہیں۔ آخر ان کا نام لینے میں کیا حرج تھا؟ ہمارے خیال میں یہی ایک آیت ڈارون کے نظریۂ ارتقار کو کلی طور پر مردود قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

تخلیقِ آدم اور قرآن:

اب دیکھیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے جو مختلف مراحل بیان فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ تراب بمعنی خشک مٹی (المومن: ۶۷) ۲۔ ارض بمعنی عام مٹی یا زمین (نوح: ۱۷) ۳۔ طین بمعنی گیلی مٹی گارا (الانعام: ۲) ۴۔ طین لازب بمعنی لیسدار اور چیکدار مٹی (الصّٰفّٰت: ۱۱) ۵۔ حمأ مسنون بمعنی بدبودار کیچڑ (الحجر: ۲۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ صلصال بمعنی ٹھیکرا۔ حرارت سے پکائی ہوئی مٹی (ایضاً) ۷۔ صلصال کالفخار۔ بمعنی ٹن سے بجنے والی ٹھیکری۔ (الرحمٰن: ۱۴)

یہ ساتوں مراحل بس جمادات میں پورے ہو جاتے ہیں۔ مٹی میں پانی کی آمیزش ضرور ہوئی لیکن پھر وہ بھی پوری طرح خشک کر دیا گیا۔ غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسان کے جو سات مراحل بیان فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی نوع (جمادات) سے متعلق ہیں۔ ان میں کہیں نباتات اور حیوانات کا ذکر آیا ہے؟ اگر انسان کی تخلیق نباتات اور حیوانات کے راستے سے ہوتی تو ان کا بھی کہیں تو ذکر ہونا چاہیے تھا۔

پھر قرآن میں یہ بھی مذکور ہے:

"قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ" (الزمر ۷)

"خدا نے فرمایا کہ اے ابلیس جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟"

اب خدا کے ہاتھوں سے اس لیے انکار کر دیا جائے کہ خدا کے متعلق تجریدی تصور ہی راہِ صواب ہے۔ "یا "ید" سے مراد قوت و قدرت ہے اور حدیث اگر آیت کی تائید کرے تو اسے ظنی کہہ دیا جائے اور اگر تورات بھی تائید کرے تو اس کی ہر ایسی آیت کو محرف قرار دیا جائے جو آپ کے قرآنی فکر سے متصادم ہو۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد نظریۂ ارتقاء، جیسے ناقابلِ اعتماد نظریہ کو صحیح قرآنی فکر قرار دیا جائے تو دلائل کی بات رہ کہاں جاتی ہے؟

قصۂ آدم و ابلیس

جنت، شجرِ ممنوعہ اور ہبوطِ آدم:

اب پرویز صاحب کی زبانی سنیے کہ آدم و ابلیس کی تمثیلی داستان کیا ہے؟ اور جنت، ابلیس، آدم، ملائکہ وغیرہ سے کیا مفہوم ہے؟ فرماتے ہیں:

"جنت کی زندگی سے مراد نوعِ انسانی کی زندگی کا وہ ابتدائی دور ہے جس میں رزق کی فراوانیاں تھیں[1]..... انسان ملکیت کے لفظ سے نا آشنا تھا، جس کا

---

[1] سرسید جنت سے مراد انسان کا عہدِ طفلی، شجرِ ممنوعہ سے مراد عقل و شعور اور ہبوطِ آدم سے مراد عقل و شعور کے بعد کی زندگی لیتے ہیں۔ پرویز صاحب اس مسئلہ میں سید صاحب سے پورا پورا اختلاف رکھتے ہیں اور بالکل نئی تاویلات پیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں جی چاہے سامانِ زیست لے لیتا۔ جس کا پہلا دور قبائلی زندگی کا تھا۔ یعنی اب نوع انسانی مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر الگ الگ ہو گئی۔

عربی زبان میں الگ الگ ہونے کو مشاجرت کہتے ہیں۔ اسی کا نام وہ شجر ہے جس کے قریب جانے سے انسان کو روکا گیا تھا۔" (ابلیس و آدم ص ۵۱، ۵۲)

اب دیکھیے کہ (۱) اگر جنت سے مراد رزق کی فراوانیاں ہی ہے تو اس سے تو انسان کے سب آباؤ اجداد اور دیگر حیوانات فائدہ اٹھا رہے تھے۔ آدم و حوا کو جنت میں آباد کر کے خدا نے اس جوڑے پر کونسا احسان فرمایا تھا؟

۲۔ مشاجرت کے معنی تو واقعی الگ الگ ہونے کے ہیں لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا مشاجرت اور شجر کے ایک ہی معنی ہیں؟ شجر اسم جنس ہے اور شجرۃ بھی ایک درخت کو کہتے ہیں، الگ الگ بننے کو نہیں کہتے۔ جب کبھی یہ لفظ بطور اسم استعمال ہو گا اس کے معنی درخت ہی ہوں گے۔

۳۔ جس کسی آدمی کو اللہ نے اس شجر یا مشاجرت سے منع کیا تھا (یعنی الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جانا) وہ تو پہلے ہی واقع ہو چکی تھی۔ ایک چیز کے ہو جانے کے بعد یہ کہنا کہ "ایسا نہ کرنا" کیا معنی رکھتا ہے؟

ابلیس اور ملائکہ:

"انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دُنیا میں سب کچھ میرے ہی لیے ہونا چاہیے، ابلیس کہلاتا ہے"

"ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع فرمان ہیں.... وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔" (ص ۵۲ ایضاً)

"وُہ جذبہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ وُہ اسے حیاتِ جاوید عطا کرے گا اور اس کا ذریعہ بتلایا اولاد۔ یہ ہے مفہوم اس تمثیلی بیان کا جس میں کہا گیا ہے کہ اس حیاتِ جاوید کے حصول کی تمنا میں انسان کے جنسی ترغیبات ابھر کر سامنے آگئے۔" (ابلیس و آدم ص ۵۳)

۱۔ اب دیکھیے، ابلیس کی کئی تعبیریں یہ لوگ کرتے ہیں۔ کہیں اس سے مراد عقلِ بیباک ہوتی ہے جو وحی کے تابع نہ ہو۔ کہیں ابلیس سے سرکشی اور بغاوت مفہوم لیا جاتا ہے۔ کہیں اسے ذاتی مفاد سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یہ لفظ بس موم کی ناک ہے جدھر چاہیں موڑ لیں۔ البتہ ان سب معانی میں ایک بات بطور قدرِ مشترک ضرور پائی جاتی ہے اور وُہ یہ ہے کہ ابلیس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس نے تو خدا کے سامنے جھگڑا ہی یہ کھڑا کیا تھا، کہ میں آدم سے افضل ہوں۔ اگر انسان کے علاوہ ابلیس کا تصور ممکن نہیں تو یہ جھگڑا آخر کس نے کیا اور کس سے کیا؟

۲۔ یہی حال لفظ "ملائکہ" کا ہے لیکن اس سے مراد انسان کے اندر نیکی کی قوتیں سمجھا جاتا ہے، کبھی اسے ملکہ فطری سے تعبیر کیا جاتا ہے کبھی کائنات کی خارجی قوتوں سے۔ اس مقام پر ان قوتوں کو رزق سے محدود کر دیا گیا ہے۔ ان سب تعبیروں میں قدر مشترک یہی ہے کہ ملائکہ اپنا کوئی خارجی وجود یا تشخص نہیں رکھتے جبکہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ ان کا خارجی وجود ہے اور ان پر ایمان لانا ایمان بالغیب کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ ابلیس کے فریب سے آدم اور اس کی بیوی نے درخت کا پھل چکھ لیا تھا۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ "وہ پھل جنسی ترغیبات تھیں، جس کے ذریعہ اولاد پیدا ہوتی ہے اور انسان بزعم خود حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (اس نظریہ کے مطابق) جنسی ترغیبات تو انسان سے بہت پہلے بندر میں بھی اور اس سے پہلے دیگر حیوانات میں بھی موجود تھیں۔ اور اس سے بہت عرصہ بعد انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالتیں طے کرتا ہوا انسان بنا ہے۔ توالد و تناسل اور اولاد کا سلسلہ بھی بندروں میں موجود تھا۔ پھر اس مقام پر ابلیس نے آدم کو جنسی ترغیبات کی یہ کیا پٹی پڑھائی تھی؟

نظریۂ ارتقاء اور اسلامی تعلیمات کا تقابل

۱۔ قرآن انسان سے متعلق اشرف المخلوقات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ نظریۂ ارتقاء اسے بندر کی اولاد قرار دے کر اسے پست مقام پر لے آتا ہے۔ بندر انسان کے بمقابلہ حقیر تر اور ذلیل تر مخلوق ہے جس کا اعتراف سرسید احمد نے بھی "کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ" کی تفسیر کے تحت کیا ہے۔

مغربی مفکرین کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہوں نے جب بھی انسان سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے۔ ہیں تو اسے حیوانی سطح سے اوپر نہیں اٹھنے دیتے۔ ارسطو نے انسان کو حیوانِ ناطق کہا، ڈارون نے اسے بندر کی اولاد قرار دیا۔ سگمنڈ فرائڈ نے اسے جنسی حیوان کہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مارکس و لینن نے انسان کو معاشی حیوان سے تعبیر کیا جبکہ قرآن انسان کو تمام مخلوقات سے بلند تر مقام پر فائز کرتا ہے۔ ارشادِ باری ہے :

" وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا " (بنی اسرائیل ۷۰)

" اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی "

۲۔ نظریۂ ارتقاء وحدتِ حیات کا تصور پیش کرتا ہے جبکہ قرآن مجید " كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً " کہہ کر وحدتِ امت کا تصور پیش کرتا ہے۔ وحدتِ امت سے مراد یہ ہے کہ جو حقوق اللہ نے انسان کو دیے ہیں دوسری کسی مخلوق کو نہیں دیے۔ مثلاً انسان حلال جانوروں کو ذبح کر کے کھا سکتا ہے اور ان سے اور بھی کئی طرح سے استفادہ کر سکتا ہے لیکن نظریۂ وحدتِ حیات انسان کو ایسے حقوق عطا نہیں کرتا۔ اسی بناء پر ہندوؤں کے ہاں اہنسا کا اصول کارفرما ہے اور وحدت الوجود کے قائلین جانوروں کو بھی بالکل اپنے ہم مرتبہ تصور کرتے ہیں۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کا انحصار ایمان بالغیب پر ہے۔ ایمان بالغیب کے اجزاء یہ ہیں : خدا پر ایمان، فرشتوں کے خارجی وجود پر ایمان، نبیوں پر ایمان، الہامی کتابوں اور یومِ آخرت پر ایمان جبکہ نظریۂ ارتقاء ایمان بالغیب کے اکثر اجزاء کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب میں متفرق مقامات پر ذکر آیا ہے!

۴۔ نظریۂ ارتقاء الحاد کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ اس کا سب سے پہلے اثر اس نظریہ کے بانی ڈاروِن پر ہوا۔ اشتراکی دہریت پسند اس نظریہ کا پرچار صرف اسی لیے کرتے ہیں کہ یہ نظریہ مذہب سے دور لے جاتا ہے حالانکہ اشتراکی فلسفہ کی بنیاد نظریۂ اضداد یا جدلی نظریہ پر ہے جو نظریۂ ارتقاء کے مخالف ہے۔ تاہم یہ لوگ نظریۂ ارتقاء کا پرچار محض اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے مذہب سے تنفر اور اشتراکیت کے لیے راستہ ہموار ہو سکے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ نظریۂ ارتقاء اسلام کے بنیادی عقائد سے براہِ راست متصادم ہے۔

نظریۂ ارتقاء کا مستقبل :

نظریۂ ارتقاء کا مطالعہ کرنے سے از خود یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ انسان جو ارتقائی منازل طے کرتا ہوا حیوانیت سے گزر کر درجۂ انسانیت تک پہنچا ہے تو اب اس کی اگلی منزل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا ہو گی؟ یہ نظریہ اگلی منزل کی کوئی نشاندہی نہیں کرتا۔ البتہ مغربی مفکرین یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اب انسان کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی ہو گی۔ پرویز صاحب اس سوال کے جواب میں پروفیسر جوڈ کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

"انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہو گی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے درجہ پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے پھر اس کی جبلّی ضرورتوں نے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور اسٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے، اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ترقی کی طرف ہو گا۔"

(قرآنی فیصلے ص ۲۴۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ انسان کے اس فجائی ارتقاء نے، جس سے اسے قوتِ اختیار و ارادہ حاصل ہوا تھا اس کے مادی ارتقاء کو ختم کر دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی آخری منزل بس انسان ہی ہے۔

۲۔ اگر طبیعی ارتقاء ہی نے حیوانی زندگی کو مجبور کیا تھا کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے تو حیوانی زندگی تو آج بھی موجود ہے لیکن کیا طبیعی ارتقاء نے کسی حیوان کو مجبور کیا ہے کہ وہ انسانی زندگی میں قدم رکھے؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً ایسا نہیں تو یہ نظریہ از خود غلط قرار پاتا ہے۔

۳۔ ذہنی ترقی تو واضح ہے کہ کبھی پتھر کا زمانہ تھا، پھر دھات کا زمانہ آیا، پھر صنعت و حرفت کا۔ آج ایٹمی دور ہے لیکن اس میں نفسی ترقی کی کیا بات ہوئی؟

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

پرویز صاحب کا نظریۂ ارتقاء سے متعلق ایک مضمون پڑھنے کے بعد کسی نے سوال کیا کہ:

"آپ نے لکھا کہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان ہیں مادی تغیرات سے زیادہ اور کچھ نہیں، مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہونا چاہیے، کیا صراطِ مستقیم پر چلنے کے معنی یہی ہیں؟ یعنی جس خط پر اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اسی پر آگے ارتقاء ہو"! (قرآنی فیصلے ص ۲۲۵)

اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم سے مراد پرویز صاحب کے نزدیک وہ لائن ہے جس پر زندگی سفر کرتی ہوئی پہلے جرثومۂ حیات سے انسان تک پہنچی ہے اور اس صراطِ مستقیم کی اتنی منازل انسان طے کر چکا ہے، اب یہ صراطِ مستقیم آگے کہاں جاتا ہے۔ اس کی تفصیل بھی پرویز صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"آپ نے صراطِ مستقیم سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، قرآن سے پہلے ذہنِ انسانی دوری حرکت کا قائل تھا جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکیاتی (DYNAMIC) تصور پیش کر کے بتایا کہ حیات کسی چکر میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے والی ہے۔ صراطِ مستقیم سے اس غلط فلسفۂ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال ہو گیا اور اس صحیح مقصودِ حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا، پھر چونکہ مستقیم میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ اس لیے یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ زندگی مختلف قوتوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ "صراطِ مستقیم" پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو کسی نچلے نقطے سے اوپر کے نقطے کی طرف جائے "لتركبن طبقا عن طبق (۸۴/۱۹)" تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ صراطِ مستقیم تمہارے اس نشوونما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے جو ذی معارج (۷۰/۳) ہے یعنی سیڑھیوں والا خدا۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر لے جانے کا ذریعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی۔ گھسٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے (JUMP) کرتے ہوتے) اوپر چڑھنے کا ذریعہ، یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السموٰت والارض یعنی موجودہ زمان و مکان کی حدود سے آگے بھی نکل سکتا ہے۔"

(ایضاً ص ۳۴۲)

سو یہ ہے وہ صراطِ مستقیم جس پر آئندہ انسانی زندگی کا ارتقاء ہو گا۔ گویا آپ کے خیال میں قرآن صرف نظریۂ ارتقاء کی یہ پیچیدگی حل کرنے کے لیے نازل ہوا تھا کہ آئندہ زندگی کا سفر کس لائن پر ہو گا اور وہ لائن کیسی ہو گی؟ غور فرمائیے کہ انسان کے اوّلین مخاطب جو اَن پڑھ تھے، انہوں نے اس فلسفیانہ پیچیدگیوں کو سمجھ لیا ہو گا؟ بہر حال آپ نے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی آیت کہیں سے لی اور کوئی کہیں سے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی کی صراطِ مستقیم جو انسانی زندگی تک زمین ہی پر تھی۔ اب وہ اُوپر کی طرف چڑھے گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ زندگی کو اس صراطِ مستقیم کے ذریعہ اوپر چڑھنے کا فائدہ کیا ہو گا۔ آپ کے نزدیک اوپر کوئی خُدا تو ہے نہیں، وہ تو ہر جگہ موجود ہے، پھر اُوپر جا کر زندگی کرے گی کیا؟

ایک روحانی بزرگ صراطِ مستقیم کا تصور کچھ اس طرح پیش کرتے تھے کہ ذاتِ باری سے ہر ایک جاندار ایک رُوحانی شعاع کے ذریعے منسلک ہے۔ اور اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے تھے:

"مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا" (هود ۵۶)

"(زمین پر) جو کوئی چلنے پھرنے والا ہے خدا اس کی چوٹی کو پکڑے ہوتے ہے۔"

ان کے تصور کے مطابق اس رُوحانی شعاع کا ایک سرا ہر جاندار کے دماغ میں پیوست ہے اور دُوسرا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہی رُوحانی شعاع صراطِ مستقیم ہے اور اسی پر روحانی سفر ہو گا۔ اس زمین سے اُوپر ہوائی کرہ کے بعد سب سے پہلے جہنم آتا ہے پھر اعراف، پھر جنت، پھر عالم لاہوت، ملکوت، مثال اور عالم امر ہیں۔ پھر اس کے بعد عرشِ الٰہی ہے اور اس سے اوپر ذاتِ باری تعالیٰ۔ اور بزعم خویش یہ بزرگ یہ روحانی سفر طے بھی کر چکے تھے۔ ان کی صراطِ مستقیم سے متعلق یہ تحقیق یا اُن کی دُوسری تحقیقات ٹھیک ہوں یا غلط، اس سے ہمیں سروکار نہیں، البتہ ایک بات ان کی قابلِ فہم ہے اور وہ یہ کہ وہ خدا کو اُوپر سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کی صراطِ مستقیم کا رُخ اُوپر کی طرف ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر پرویز صاحب کے نزدیک خُدا اُوپر تو ہے نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ ہر جگہ موجود ہے۔ پھر انہیں صراطِ مستقیم کو اُوپر کی طرف لے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اور یہ سوال بھی تاحال حل طلب ہے کہ اس صراطِ مستقیم کے ذریعہ ارتقاء کی اگلی منزل کیا ہوگی؟ اسی سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں:

ارتقاء کی اگلی منزل:

"ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نہ تو انسان خالص طبیعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے (بلکہ اس کی انسانیت طبعی ارتقاء کے سلسلہ علت و معلول سے الگ ہے) اور نہ ہی اس کا مزید ارتقاء طبیعی ہوگا۔ طبیعی ارتقاء کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے، اس میں جوہرِ انسانیت غیر طبیعی ہے۔ جسمِ انسانی میں اس جوہرِ انسانیت کے فیصلوں کے لیے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ۔ اس کے بعد مزید ارتقاء جسمانی نہیں بلکہ جوہرِ انسانیت کا ہوگا جسے ہم موت کہتے ہیں وُہ درحقیقت جوہرِ انسانیت کا جسم کے آسرے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہرِ انسانیت (انسانی اختیار و ارادہ) کی نشو و ارتقاء قرآنی نظامِ ربوبیت سے ہوتی ہے۔ زندہ وُہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآن کی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مسخر کیے جاتی ہیں۔ نہ کہ وُہ جس کے جسم کی طبیعی مشینری چل رہی ہے۔ جو اس طرح زندہ ہے وُہ موت سے مر نہیں سکتا، اسی کا نام ارتقاء کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔" (ایضاً ص ۳۴۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ ارتقاء کی اگلی منزل موت ہے جب جسم کا آسرا ختم ہو جائے گا۔

۲۔ لیکن یہ ارتقاء کی منزل وُہی طے کر سکے گا جس کا جوہرِ انسانیت نشوونما یافتہ ہو ——— جو قرآنی نظامِ ربوبیت کے اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موت تو سب کو آتی ہے اور جسم کا آسرا بھی سب کا ختم ہوتا ہے۔ جو لوگ نظامِ ربوبیت کے ذریعہ اپنے جوہرِ انسانیت کی نشوونما کر لیں گے وُہ تو ارتقاء کی اگلی منزل طے کر جائیں گے۔ اور جو اس نظام کو اختیار نہیں کرتے یا اس پر ایمان نہیں لاتے ان کا کیا بنے گا؟

آخرت کا تصوّر:

"جسم کا کام انسانی قوتِ فیصلہ (نفس) کے لیے معلومات فراہم کرنا اور اس کے

© rasailojaraid.com

فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا (یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت یا قانونی معاشرے میں) اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائے گی اسی قدر انسانی زندگی ابدیت سے ہمکنار ہوتی جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبیعی قانون کے تحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا، اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔" (ایضاً ص ۳۴۷)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت نظریۂ ارتقاء کا اصول بقاء لاصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) لاگو ہو گا۔ پھر جس انسان نے اپنے نفس کو قرآنی نظامِ ربوبیت کے ذریعہ جس قدر پختہ کر لیا ہو گا، اسی قدر اس کا نفس ابدیت سے ہمکنار ہو گا۔ اسی نظریہ کا دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ جن لوگوں نے اس نظام کے ذریعہ اپنے نفس کو پختہ نہیں بنایا وہ ختم ہو جائیں گے اور تربیت یافتہ نفوس جو ابدیت سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔ ان کو معلومات فراہم کرنے کے لیے (نیا جسم نہیں) بلکہ نیا نظام بھی مل جائے گا۔

اخروی زندگی:

اب کسی صاحب نے اس نئے نظام کے متعلق آپ سے مزید روشنی ڈالنے کی درخواست کی تو آپ نے اس کی وضاحت بدیں الفاظ فرمائی:

"زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کی آئندہ منزل کے متعلق کچھ معلوم کر سکے۔ ہمارے ذرائع معلومات، ہمارے حواس و احساسات ہیں اور ان کا تعلق محسوسات و مدرکات سے ہے۔ لہٰذا جو چیزیں اس دائرہ سے باہر ہوں۔ ان کے متعلق ہم اپنے موجودہ ذرائع معلومات سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے آنے والی زندگی کیسی ہو گی؟ اس کا نظام کیا ہو گا؟ اس کی شکل و صورت کیا ہو گی؟ ہم نہیں جان سکتے۔ اس پر البتہ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے، اس لیے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی یقینی ہے۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رُخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔"

"علاوہ ازیں اس زندگی میں اس کاوش کی ضرورت بھی نہیں کہ آنے والی زندگی کی کیفیت کیا ہو گی؟ آنے والی زندگی کا تعین قانونِ مکافاتِ عمل کے لیے ضروری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور جس شخص کا ایمان ہے کہ زندگی مسلسل ہے۔ اس کا یہ ایمان قانونِ مکافاتِ عمل کی غیر منقطع ہمہ گیری کے لیے کافی ہے۔ یہی وہ ایمان ہے جس پر اسلامی تصوّرِ حیات کی عمارت اٹھتی ہے۔" (ایضاً ص ۱۰۳)

سائل نے جو نئے نظام پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا تو اس کا جواب آپ نے دو صورتوں میں دیا ہے۔

۱۔ ہم موجودہ احساسات سے اس نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔

۲۔ اس نظام کو سمجھنے کی ہمیں اس دُنیا میں کوئی ضرورت بھی نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے جو آخرت، یوم جزا (سزا) جنت و دوزخ کی لاتعداد تفصیلات بیان کی ہیں اور حضور اکرمؐ نے اپنی مکی زندگی کا بیشتر حصّہ اس نئے نظام کو ہی ذہن نشین کرانے پر صرف کر دیا، کیا اس سے ہم صرف اس وجہ سے قطع نظر کر لیں کہ وہ نیا نظام ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ وحی سے روشنی حاصل کرنے اور ایمان بالآخرت کا کیا مطلب ہے؟ اب نئے نظام کے ادراک کی ضرورت تو یہ ہے کہ اسی ادراک اور عقیدہ کی بناء پر ہماری یہ دنیوی زندگی بگڑتی یا سنورتی ہے۔ اگر انہیں جاننے کی ضرورت ہی نہیں تو قرآن نے اتنی تفصیلات کیوں بیان کی ہیں؟

آپ زندگی کے غیر منقطع ہونے پر ایمان صرف اس لیے نہیں رکھتے ہیں کہ اس پر اسلامی تصوّرِ حیات کی عمارت اٹھتی ہے بلکہ اس کی دوسری وجوہ بھی آپ نے بیان فرما دی ہیں۔

۱۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رُخ بھی اس طرف ہے کہ اس زندگی کے بعد دُوسری زندگی کا امکان یقینی ہے۔

۲۔ مکافاتِ عمل کا وہ بے لچک قانون جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جسے مادہ پرست بھی تسلیم کرتے ہیں۔

ہمارے اس خیال کو بدظنی پر محمول نہ کیا جائے۔ اگر وحی پر ایمان لانے کی بات درست ہو تو پھر نئے نظام کی تفصیل میں ہمارے موجودہ حواس پر انحصار کی ضرورت بھی کب پیش آتی ہے؟ ایمان بالغیب تو اسی چیز کا نام ہے کہ جو باتیں ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہیں۔ انہیں ہم صرف اس لیے درست تسلیم کریں کہ وہ بذریعہ وحی ہم تک پہنچی ہیں۔

طلوعِ اسلام کا تضاد:

پرویز صاحب بہرحال اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی غیر منقطع ہے اور موت کے بعد بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاری رہے گی، لیکن آپ کے استاد جناب حافظ اسلم صاحب مرنے کے بعد اور قیامت تک کے درمیانی عرصہ یعنی برزخ میں کسی طرح کی زندگی کے قائل نہیں۔ قرآنی فیصلے میں ایک طویل مضمون، عذابِ قبر کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں حافظ صاحب موصوف نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ از روئے قرآن، برزخ میں کوئی زندگی نہیں، جبکہ پرویز صاحب زندگی کے غیر منقطع ہونے کے قائل ہیں۔

شعر و ادب

مولانا عبدالرحمٰن عاجزؔ

کیا جانئے وُہ کس حال میں اب زیرِ زمیں ہے!

اس چیز کی خواہش جو مقدر میں نہیں ہے — دراصل یہ تعذیب ہے جو سخت تریں ہے!

تقدیر کے لکھے پہ جو ایماں ہے یقیں ہے — پھر کس لیے آلام و مصائب پہ حزیں ہے

ہر شے سے جھلکتا ہے ترا چہرۂ روشن — پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ تُو پردہ نشیں ہے

ہر غنچۂ رنگیں ہے ترے حسن کا مظہر، — ہر ذرۂ خاکی ترے جلووں کا امیں ہے!

ملتی ہے یہیں سے مہ و اختر کو بلندی، — خم در پہ ترے میری عقیدت کی جبیں ہے

ہے جس پہ عمل راحت و عظمت کی ضمانت — ادیانِ زمانہ میں وُہ اسلام ہی دیں ہے!

چلتا تھا زمیں پر جو کبھی ناز و ادا سے، — کیا جانئے وُہ کس حال میں اب زیرِ زمیں ہے،

اس عمر کے دو ساتھی ہیں راحت بھی، الم بھی، — گلشن میں جہاں پھول ہے کانٹا بھی وہیں ہے،

ہشیار، خبردار، سنبھل کر اسے چھونا، — دُنیا جسے کہتے ہیں، یہ اک مارِ حسیں ہے

تھی چاروں طرف دھوم کبھی جن کی جہاں میں — ان میں سے کوئی آج مکاں ہے نہ مکیں ہے

ہوتے ہیں زن و مرد جہاں اجنبی دونوں — سمجھو کہ وہاں تیسرا شیطانِ لعیں ہے

کم خوری و کم خوابی و کم گوئی کے اوصاف — جس میں ہوں وُہ انسان حقیقت میں حسیں ہے

تم جادۂ عصیاں پہ کبھی پاؤں نہ رکھنا — ہر ایک قدم اس کا ہلاکت کے قریں ہے

اس عمر کو غفلت میں وُہ ضائع نہیں کرتا

عاجزؔ جسے احوالِ قیامت پہ یقیں ہے!

© rasailojaraid.com